مولوی محمد عبدالرحمٰن البازی

دنیائے علم کا مینار

شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد موسیٰ الروحانی البازی طیب اللہ آثارہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۔اکتوبر بروز سوموار سسکتی وآہیں بھرتی مغموم وآداس شام کو محدث اعظم نجم المفسرین، زبدۃ المحققین العلامۃ شیخ الشیوخ مولانا محمد موسیٰ الروحانی البازی طیب اللہ آثارہ' واعلی اللہ درجاتہ' بھی اپنے رب سے جاملے اور اس شان سے جاملے کہ اللہ ہی کے گھر میں..... اللہ ہی کے ذکر میں مشغول تھے کہ موت آئی کہ دوست کا پیغام آگیا..... دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کردیا..... آخری بار جو دھڑکا تو اللہ ہی کے نام پر دھڑکا..... یہ دل عجب دھج سے زندہ رہا اور اب جب یہ خاموش ہوا تو اسکی گونج ایک دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ایک دنیا میں سنی جاسکتی ہے.....اس کے چرچے ایک دنیا کے سینوں میں ہیں..... اس کیلئے ایک دنیا تڑپ رہی ہے، ایک دنیا رو رہی ہے..... اور ایک دنیا کی زبانوں پر دعائیں ہیں..... زبانیں تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں، ہاتھ مغفرت کیلئے اٹھ گئے ہیں: فموتک موتُ عالَمِنابأرضٍ مع سمٰواتٍ

فیبکی کل مَن فیھا ویبکینا ویؤلمنا

"یعنی آپکی موت زمین ووسیع سماوات سمیت سارے عالم کی موت ہے۔ پس عالم کے کل سکان خود بھی رو رہے ہیں اور ہمیں بھی رلاتے ہوئے غمگین کرتے ہیں"۔ یوں تو موت سنت بنی آدم ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں، یہاں جو بھی آیا، جانے ہی کیلئے آیا، لیکن بعض حضرات کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی لائق رشک ہوتی ہے۔رب کائنات نے ایسا حسین اور مبارک خاتمہ انہیں نصیب فرمایا جو ہر مسلمان کیلئے قابل رشک ہے۔ دین متین کا یہ خادم ومجاہد جو قال اللہ وقال الرسول ﷺ کے ماحول میں پروان چڑھا تھا۔ قال اللہ وقال الرسول ﷺ ہی کی بات کرتا کرتا دنیا

سے رخصت ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یوں تو ہر ایک نے ایک نہ ایک دن یہ راہ ضرور دیکھنی ہے مگر کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جنکی موت صرف فرد واحد کی موت ہی نہیں بلکہ پوری ملت کی موت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ "موت العالم موت العالم" خصوصاً اگر رخصت ہونے والے کا وجود دنیا کیلئے باعث رحمت ہو انکی ذات سے عالم اسلام کی خدمات وابستہ ہوں تو ان کا صدمہ ایک عالم کی بے کسی، بے بسی و محرومی اور یتیمی کا موجب بن جاتا ہے۔

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

محدث اعظم، شیخ المشائخ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی نور اللہ مرقدہ و اعلی اللہ درجاتہ بیشمار خوبیوں کے مالک تھے اور شاید ہی کوئی خوبی ایسی ہو گی جو حضرت شیخؒ کو اللہ تعالیٰ نے عطا نہ فرمائی ہو۔ وہ اپنے عہد میں دنیا بھر کے ذہین لوگوں میں سے ایک تھے۔ لاریب! انکی شخصیت سدا یادگار رہیگی، اس وقت انکی موت سے چمنستان اسلام اجڑ گیا ہے۔ علماء یتیم ہو گئے ہیں اور خصوصاً ہمارا گھرانہ بہت زیادہ نڈھال ہو گیا۔ ان کے سامنے ہمیشہ ہی میں اپنی مشکلات پیش کرتا تھا۔ مختلف مسائل کے بارے میں ان سے سوالات کرتا تھا، متعدد مشکلات کا حل طلب کرتا تھا اور وہ ہمیشہ ہی شفقت و محبت سے میرے سوالات کا جواب دیتے اور مشکلات کو حل کر دیتے تھے۔ انکی باتیں بے شمار ہیں ان کے سنانے والے بھی بے شمار ہیں۔ انکی زندگی کے مختلف گوشے مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کیطرح موجود ہے:

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستان کے ہیں

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ اکوڑہ خٹک کے مرثیہ میں حضرت شیخؒ اپنے شہرۂ آفاق منظوم مرثیہ "فتح الصمد" میں (جس میں چھ سو سے زائد اسمائے اسد مذکور ہیں) شاید یہ اشعار اپنے لئے کہہ گئے:

لموتک قد بکت ارض وعرش ثم کرسی

آپکی موت پر ماتم کناں ہیں زمین، عرش، کرسی

وافلاک و انجمھا و کعبتنا و زمزمنا

آسمان، ستارے، کعبۃ اللہ اور زمزم شریف

و باکستانُ مع ھندٍ مساجدُنا، مدارسُنا

نیز غمگین ہے سارا پاکستان ہند، ہماری مسجدیں، مدارس

وارضُ اللہ، مکتُنا، مدینتنا، یلمَلَمُنا

اور اللہ کی پاک زمین یعنی مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور یلملم

ویبکی الطیرُ والحیتان ثم السھلُ مَع جَبَل

نیز روتے ہیں پرندے، مچھلیاں، ہموار میدان اور پہاڑ

ویبکی الجن ثم الانس اذقدفاضَ کَیخَمُنا

نیز کل جن وانس آہ و بکا کر رہے ہیں کیونکہ علم کے بڑے سلطان انتقال کر گئے۔

کسی شخص کی عزت و عظمت کا اندازہ اس کے نام ونسب سے نہیں، بلکہ سیرت و کردار اور علم و فضل سے ہوتا ہے۔ تاہم نام ونسب سے بھی بسا اوقات کسی کی خاندانی روایات، علمی برتری اور روحانی وجاہت سامنے آجاتی ہیں۔ میں اسے اللہ رب کائنات کا فضل و کرم سمجھتا ہوں کہ میرے والد ماجد محدث اعظم مولانا محمد موسیٰ البازیؒ کو قدرت نے یہ دونوں شرف عطا فرمائے۔ ہمارا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور روحانیت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، یہاں روحانی علوم کو سینہ بہ سینہ سکھایا اور چلایا جاتا ہے جس سے انسان کا باطن روشن ہو جاتا ہے۔ میرے دادا جان مولوی شیر محمدؒ ایک عالم و عارف انسان تھے۔ وفات کے بعد والد صاحبؒ قبر پر زیارت کیلئے حاضر ہوتے تو قبر میں سے قرآن حکیم کی تلاوت کی آواز سنائی دیتی، خصوصاً "سورۂ ملک" کی تلاوت کی آواز آتی۔ حدیث شریف میں سورۂ ملک کے بارے میں آیا ہے کہ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کیلئے شفاعت کا باعث بنتی ہے۔ یہ انکی عجیب و غریب کرامت تھی جس کو والد ماجدؒ نے اپنی کتاب "اثمار التکمیل" (یہ حضرت شیخؒ کی تصنیف کردہ بیضاوی شریف کی شرح "ازھار التسہیل" کا دو جلدوں میں مقدمہ

ہے، اصل کتاب تقریباً پچاس جلدوں پر مشتمل ہے) میں بھی تفصیلاً ذکر فرمایا ہے۔ اس طرح ہمارے جد امجد احمد روحانی بھی بہت بڑے عالم اور صاحب فضل و کمال انسان تھے۔ افغانستان میں غزنی کے پہاڑوں کے مضافات میں ان کا مزار اب بھی مرجع عوام و خواص ہے۔ اس طرح ہمارا خاندان برسوں سے علم کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ مجموعی طور پر میں نے اپنے والد کو اپنی شعوری زندگی میں پانچ حیثیتوں سے دیکھا ہے: باپ، مربی، استاد، عالم، مصنف۔

بڑے ہو کر جب مجھے اچھے برے کی تمیز ہوئی تو میرے چھوٹے سے ذہن میں انکی جو قد آور شخصیت تھی وہ چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے زیادہ بڑی اور پر کشش نظر آنے لگی۔ اگر بات گھر کے معاملے سے کی جائے تو مجھے اپنے عہد شباب سے لڑکپن کے دور تک جانا ہوگا۔ جہاں میں تھا اور انکی گود تھی، ان کے شانے تھے اور میرا وجود، میرا کھیلنا اور ان کا کھلانا تھا، میری طفلانہ شوخیاں تھیں اور ان کا محبت آمیز تبسم تھا، میرا تکرار تھا اور ان کا پیار، میرا مچلنا اور ان کا بہلانا تھا، میری ضد اور ان کی دانائی تھی، میرا ہاتھ اور ان کی انگلی تھی، وہ مجھے ساتھ لیکر چلتے تھے اور میں ان کے ساتھ چل کر نہ صرف خوش ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ کوئی نئی بات سمجھتا اور سیکھتا تھا، لیکن گیا وقت واپس نہیں آسکتا۔ بیتے لمحے پلٹ نہیں سکتے۔ گزرے دور کا آنا ممکن نہیں، گزشتہ ساعتیں حال میں نہیں آسکتیں، ماضی کو حال و مستقبل نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ طویل داستان ہے جسے زبان و قلم سے بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت باپ وہ قابل فخر تھے۔ وہ صرف "حقوق والدین" کے معلم ہی نہ تھے بلکہ حقوق اولاد بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ باپ کی حیثیت میں اولاد کیلئے جو شفقت و محبت ہر باپ کو قدرت نے دی ہے وہ ان کو بھی دی تھی، لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ یہ نعمت قدرت نے ان کو زیادہ فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔ اولاد کیلئے رزق حلال فراہم کرنا، انکی جائز ضروریات کو جائز طریقے سے پورا کرنا، انکی صحیح رہنمائی کرنا، حتیٰ کہ ان کو شفقت کی نظر سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔ جب وہ گھر میں کوئی بات کرتے یا کسی سوال کا جواب دیتے تو انکی باتوں میں علم و حکمت کی تعلیم ہوتی اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے والد کی علمی اور تدریسی زندگی کی طرح انکی خانگی زندگی بھی بہت خوبصورت ہے۔ وقت کی اہمیت میں نے ان سے سیکھی۔ ان

کو کام، کام اور کام میں منہمک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوتا کہ وقت بہت قیمتی شے ہے، اسے ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ جوں جوں میں عمر کی منزلیں طے کرتا گیا والد صاحبؒ کی بے تکلفی کم ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میرے اور ان کے مابین ایک پروقار سا حجاب اور ایک غیر محسوس سا تکلف پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھے تمیز سکھانے کیلئے سختی کے بجائے حکمت استعمال کی۔ ان کا رویہ ہر ایک کے ساتھ ہمیشہ حکیمانہ رہا۔ مجھے کسی کے بتائے بغیر خود بخود ہی معلوم ہو گیا کہ والد کے ساتھ بچے ہنسی مذاق کرتے ہیں نہ بے تکلف ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے زیادہ بولتے ہیں نہ شوخیاں کرتے ہیں، وہ ایک محترم ہستی ہوتی ہے۔ ان کا ہمیشہ اور ہر حال میں احترام کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کی حکیمانہ تربیت کا اثر تھا۔ بحیثیت مربی انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، بچوں کی تعلیم و تربیت، بود و باش، رہائش، خوراک اور جائز ضروریات کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی دلایا کہ جائز ضروریات وہی ہوتی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کیا جائے جس کی ضرورت کیلئے انسان کو ناجائز طریقے اختیار کرنے پڑیں، وہ جائز نہیں ہوتی۔ ان کے طفیل ہمیں جو کچھ میسر تھا، کافی تھا۔ میں نے یا میرے بہن بھائیوں میں سے کسی نے آج تک یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ ہم حصول تعلیم کے سلسلے میں اور ضروریات زندگی کے حصول کے سلسلے میں کسی سے پیچھے ہیں یا کوئی ہم سے بہتر پوزیشن کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے وسیع اراضی، بینک بیلنس یا کوئی دوسری بڑی جائیداد بنائی بلکہ انہوں نے ہماری تربیت اس انداز میں کی کہ ہم نے تھوڑے کو ہمیشہ بہت سمجھا اور جو کچھ میسر آیا اسی پر قناعت کی۔ بحیثیت استاد وہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کوتاہی ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس کے ساتھ وہ نرم خو بھی تھے۔ اگر سبق یاد کرنے پر ان پر جلال غالب آجاتا تھا، تو سبق یاد کرنے پر ان کا جمال بھی دیدنی ہوتا تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ نرمی کے آثار دیکھے ہیں لیکن جب وہ میرا امتحان لیتے تو ان کے چہرے پر سے نرمی کے آثار یک لخت غائب ہو جاتے تھے۔ اگر سوال کا صحیح جواب نہ دیتا تو سخت گرفت اور باز پرس کرتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد طلباء جس محبت و عقیدت سے درس ترمذی کیلئے حضرت شیخؒ کا گھر کے باہر انتظار کرتے وہ

منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، جونہی حضرت شیخؒ درس کیلئے گھر سے باہر تشریف لاتے طلباء کرام عقیدت و محبت کے جذبہ سے سرشار انکی جانب دوڑ پڑتے۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ حضرت شیخؒ سے کتابیں لے اور پھر دینی طلباء کے جھرمٹ میں حضرت شیخؒ جس وقار کے ساتھ تشریف لے جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے عصر دوراں کے امام الترمذی جارہے ہیں۔ سال کے آخر میں ترمذی شریف کے اختتام پر خاص دعا کرواتے دوران دعا انکی وجد انگیز آہ وزاری سخت سے سخت دلوں کو بھی تڑپا دیتی اور انسان گریہ وزاری پر مجبور ہو جاتا۔ ایسی مقبول دعا اس سے پہلے کسی کان نے نہیں سنی ہوگی اور اس وقت طاری ہونے والا رقت انگیز منظر کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہوگا۔ درس دینے کا انداز حکیمانہ ہوتا تھا۔ درس دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے علم و آگہی کے چراغ جل رہے ہیں۔ وہ پڑھانے سے زیادہ سمجھانے کے قائل تھے، انکی سمجھائی ہوئی بات ناقابل فراموش ہوتی تھی، مشکل ترین بحث کو چند آسان جملوں میں اس طرح سمجھا دیتے کہ وہی مشکل بحث سب سے زیادہ آسان نظر آتی اور اسے انتہائی آسان الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو جاتی۔

حضرت شیخؒ بہت زیادہ وسیع النظر اور وسیع الظرف تھے، ان کے سامنے ہر وقت فقہاء کرام کی آراء رہتی تھیں۔ مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے مخالف کے نقطہ نگاہ کو تحمل اور سنجیدگی کیساتھ سنتے اور اس کے بعد پہلے اس کے دلائل کو رد فرماتے اور بعد میں اپنے دلائل (جو کہ فقہاء کی آراء پر مشتمل ہوتے تھے) دیتے۔ بحیثیت استاد انکی ایک خوبی ایسی بھی دیکھنے میں آئی جو صرف انکی ذات سے مخصوص تھی، کسی اور شیخ میں وہ خوبی نہیں تھی، یہ خوبی انہیں قدرت نے وہبی طور پر عطا فرمائی تھی۔ کسی سوال کا جواب تو دیکھ کر یا دیکھے بغیر تمام علماء دیتے ہیں۔ حضرت شیخؒ کو قدرت نے تدریس میں استخراج جواب جدید کا بھی بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ہر مسئلے پر حضرت شیخؒ کی اپنی ایک رائے تھی وہ نفس کتاب اور حواشی میں درج جولبات سے ہٹ کر جولبات جدید اور دلائل بھی دیتے تھے اور وہی جولبات اور دلائل سب سے زیادہ تسلی بخش ہوتے اور عجیب بات یہ تھی کہ یہ جولبات جدید اور دلائل جدید درس دیتے دیتے ذہن میں آتے لیکن عجز وانکساری کا یہ عالم تھا کہ جولبات اور دلائل جدید دے کر طلباء سے فرماتے کہ یہ جولبات اور دلائل اللہ تعالیٰ نے ابھی میرے

ذہن میں ڈالے ہیں، کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملیں گے۔ یعنی ہر بات کو اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کرتے کہ بندہ کچھ نہیں وہی ذات سب کچھ ہے۔ یہ عاجزی وانکساری انکی سینکڑوں تصنیف شدہ کتابوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مصنفین کی عام طور پر اپنے نام کیساتھ مختلف القاب بھی لگاتے ہیں مگر حضرت شیخؒ نے اپنی ہر تصنیف شدہ کتاب پر عاجزی وانکساری کی راہ اپناتے ہوئے اپنے نام کیساتھ ہمیشہ عبد فقیر یا عبد ضعیف (کمزور بندہ) لکھا جو انکی عظمت ومتانت اور انکساری کی واضح مثال ہے۔ عجز وانکساری کا ساتھ حالت نزع میں بھی نہ چھوڑا اور ایسی حالت میں بھی زبان ادب کا دامن پکڑے انکساری وعاجزی کی حدود میں رہتے ہوئے اس ذات وحدہ لاشریک لہ کو اس انداز سے پکارتی رہی :

"الھی انا عبدک الضعیف" : یااللہ! میں تیرا کمزور بندہ ہوں۔

بحیثیت عالم ان کا مقام بہت بلند تھا لیکن اگر اس سے مراد مجرد علم ہے تو اس بارے میں قطعیت کیساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کس پائے کے عالم تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا خود علماء کیلئے مشکل ہے جنہوں نے ان کے فقہی استدلال سنے۔ انہوں نے انہیں فقیہ ملت مانا، جنہوں نے حدیث کی خوشبو سے جہاں کو مہکاتے دیکھا، انہیں محدث اعظم نظر آئے، جنہوں نے تفسیر کے موتی لٹاتے دیکھا انہوں نے مفسر کبیر قرار دیا، جنہوں نے منطق وفلسفہ کا خزانہ بانٹتے دیکھا انہوں نے معقولات کا امام گردانا۔ جنہیں علم فلکیات کے درس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا انہوں نے ماہر فلکیات اور عظیم ریاضی دان سمجھا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخؒ بحر العلوم میں غوطہ زن ہونے اور گہرائیوں میں سے موتی سمیٹنے کے ماہر تھے، اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ میدان علم کے شہسوار تھے، وہ کتنے بڑے عالم تھے؟ یہ طویل بحث ہے تاہم اس بحث کو یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ پھل سے بھرا درخت جھکا ہوتا ہے۔ اہل علم کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کا علم انہیں معزور بنانے کے بجائے منکسر بنادیتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم نے انہیں گھریلو زندگی میں دوسروں سے بڑھ کر دیکھا ہے، انکی راتیں یاد خدا سے مہکتی اور دل خوف خدا سے لرزتا رہتا تھا۔ بڑائی ان کے قریب سے بھی نہیں گزرتی تھی، انکسار ان کا رفیق تھا۔ وہ سارا دن اپنی تصانیف اور درس وتدریس میں مصروف رہتے اور رات گئے تک تصنیفات اور مطالعہ میں

غرق رہتے۔اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تہجد کا وقت انہوں نے بستر پر لیٹ کر گزار دیا ہو۔ ہم نے انہیں راتوں کو خدا کے دربار جلال و جمال میں سر بسجود پایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمیت میں بڑا مقام عطا فرمایا تھا۔ علماء کرام مسائل کے سلسلے میں انکی طرف رجوع کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بہت بڑا مقام تھا اور یہ ان کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انکی گفتگو اور آخری مجلس اس جگہ (مسجد) کو مقرر فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا میں سب سے پسندیدہ مقام ہے اور پھر انکی قبر مبارک سے خوشبو کا جاری ہونا (جو الحمدللہ اب تک جاری ہے) انکی ولایت کی کامل نشانی ہے۔ جسکو فقیر الباذی آگے چل کر تفصیلاً ذکر کرے گا۔ (انشاءاللہ)

وہ ایک عالم باعمل، عارف باللہ، باضمیر اور باکمال انسان تھے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کہ "مومن وہ ہے جس کو دیکھ کر خدا یاد آجائے"۔ آپکی نگاہ کی تاثیر سے دلوں کی کائنات بدل جایا کرتی تھی، آپکی صحبت میں چند لمحے گزارنے سے اسلام کے عہد زریں کے بزرگوں کی صحبتوں کا گمان ہوتا تھا۔ حضرت شیخؒ میں قرون اولیٰ والی سادگی تھی، ان کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ آنکھوں میں تدبر کی گہرائیاں، آواز میں سنجیدگی اور متانت کا آہنگ نیچے دری پر آلتی پالتی مارے گاؤ تکیئے کا سہارا لئے حضرت شیخؒ کو معتقدین کے سامنے میں نے اکثر قرآن وحدیث کے اسرار ورموز کھولتے دیکھا۔ آپ منقولات ومعقولات کے جامع تھے۔ علم تفسیر، علم اصول تفسیر، علم حدیث، علم اصول حدیث، علم فقہ، علم اصول فقہ، علم کلام، علم منطق، علم فلسفہ، علم نحو وصرف، علم ادب عربی، علم تاریخ، علم ہیئت قدیمہ یونانیہ، علم ہیئت جدیدہ کوپرنیکسیہ وغیرہ تمام علوم وفنون پر مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان علوم رائجہ ومعروفہ کے علاوہ کئی ایسے علوم وفنون کے بھی ماہر تھے جن سے عام اہل علم ناواقف تھے۔ علوم وفنون میں یہ جامعیت کاملہ اس عصر میں بہت کم علماء کو حاصل ہے۔ حضرت شیخؒ نے اکثر فنون اسلامیہ قدیمہ وفنون علوم جدیدہ میں تصانیف کی ہیں۔ تصنیف وتالیف میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے علمی کارنامے زمانہ حال میں نہ صرف قابل داد ہیں بلکہ قابل رشک بھی ہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆